ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

اظہر خان
پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر میمونہ سبحانی
اسسٹنٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

سمیع اللہ قریشی کی غزل کا اسلوب (ایک تنقیدی جائزہ)

Azhar Khan
PhD Scholar, Department of Urdu, Government College University Faisalabad.
Dr. Mamuna Subhani
Assistant Professor, Department of Urdu, Government College University Faisalabad.

Style of Samiullah Qureshi's Ghazal (A Critical Review)

Prof. Samiullah Qureshi is recognized as a renowned and celebrated poet, critic and biographer. This article presents critical evaluation of the stylistic aspects of his verse (Ghazal). His poetry is embellished with the use of multiple figures of speech and poetic characteristics. Apart from the conventional fashion, he has also made use of modern poetic style. This article elaborates and illustrates the technical merits of his ghazal.

Keywords: *Ghazal, Poetry, Style, Simile, Rhythm, Samiullah.*

اسلوب کا مطلب طور، طریقہ، وضع، انداز، روش یا حکمتِ عملی ہے۔ اسلوب کی خصوصیات کا ذکر کیا جائے تو ایک اچھے اسلوب میں جو صفات موجود ہونی چاہیں اُن میں سادگی سرِ فہرست ہے۔ جس اسلوب میں کسی قسم کی پیچیدگی نہ ہو اس میں سادگی، سلاست اور صفائی پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ بھی معانی کے لوازم کے پہلو بہ پہلو سادہ ہوتے ہیں اور مطلب بالکل واضح ہوتا ہے۔ اسلوب کی دوسری صفت "قطعیت" ہے۔ سادگی کے مقابلے میں یہ اسلوب کی وہ صفتِ خاص ہے جس میں فکر کے سررشتے پیچیدہ اور جذبے کے پہلو دقیق ہوتے ہیں۔ ان کی آمیزش طبعاً ایسے الفاظ کا تقاضا کرتی ہے جو چاہیے پیچیدہ ہوں لیکن وضاحت طلب کے اعتبار سے وہ کسی طرح سادگی سے کم نہ ہوں۔ اسلوب کی تیسری خصوصیت اختصار کی ہے جس اسلوب میں اختصار سے کام لیا جائے وہ بیان میں مناسب

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

اور سمجھنے میں بالکل موزوں ہوتا ہے۔

سمیع اللہ قریشی نے اپنے کلام میں فکر کے ساتھ ساتھ فن کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں فکری و موضوعاتی محاسن کے ساتھ ساتھ فنی محاسن کا بھی خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے جہاں موضوعات سے قاری کو متاثر کیا ہے وہاں فن کے تمام لوازمات کو استعمال کر کے قاری کی جستجو کو بڑھایا ہے۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی قدرت لب و لہجے کی انفرادیت محاورہ بندی، خطیبانہ و استفہامیہ انداز اور مختصر بحروں کے دلآویز نمونے ملتے ہیں۔ ذیل میں ان کے بعض اہم و شاندار فنی محاسن کا ذکر کیا جارہا ہے۔

اُردو شاعری کے کلاسیکی شعرا کا کلام آج بھی اتنا شاندار اور طرزِ جدید کا حامل ہے کہ اسے پڑھ کر ایک طرح سے تازگی اور فرحت کا احساس ہوتا ہے اور موجودہ نسل کے نوجوان انہیں کلاسیکی شعرا میں سے کسی کو اپنا آئیڈیل بنا کر الفاظ کی بازی گری اور جذبات و خیالات کی ترجمانی کا سفر شروع کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ ایک شاندار روایت ہے اور اسی روایت ہی کے اثر کے باعث آج کے دو کے جدید شعرا کے ہاں بھی کلاسیکل شعرا اور کلاسیکل شاعری کا اسلوب بالکل واضح اور عیاں نظر آتا ہے۔

اقبال کے کلام میں بھی یہ اثر میر تقی میرؔ کے رنگ میں نظر آتا ہے اور پھر یہ سلسلہ ایسا چل نکلتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اس روایت کو خوش دلی اور کھلے ذہن کے ساتھ اپنایا گیا ہے۔

سمیع اللہ قریشی بھی اُن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے کلاسیکل شعر و ادب اور کلاسیکل شعرا کا سا طرزِ بیان اپنایا ہے۔ ان کی شاعری میں یہ طرزِ بیان صبحِ روشن کی طرح بالکل واضح نظر آتا ہے۔ کلاسیکل شعرا کی بحروں میں اور ان کی زمین میں شعر کہنے کی کئی مثالیں سمیع اللہ قریشی کی غزل میں خاص طور پر نظر آتی ہیں۔ یہ یقیناً آسان کام نہیں ہے۔ ایک خاصا دقیق عمل ہے اس بحر و زمین میں ہمہ وقت مقید ہو کر شعر کہنا ہوتا ہے جس سے الفاظ کا چناؤ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی مشہور بحر اور زمین میں اس طرح شعر کہنا کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھو جائے۔ اتنا ہی تخلیقی عمل ہے جتنا کہ کوئی شعر کہنا۔ ایک اور مشکل جو اس طرزِ بیان میں سامنے آتی ہے وہ ردیف اور قافیہ کی پابندی ہے ساتھ ہی الفاظ کا چناؤ ایسا رکھنا ہوتا ہے کہ سادگی، سلاست اور شیریں بیانی کا تاثر بہر طور موجود رہے۔

اس سلسلے میں سمیع اللہ قریشی کی شاعری میں کچھ مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ کلاسیکل شعرا سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ ان کے طرزِ بیان میں شعر کہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ نہ

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

صرف ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے بلکہ کلاسیکی شعرا سے ان کا والہانہ دلی وابستگی کا اظہار بھی ہے۔ اس تناظر میں سمیع اللہ قریشی کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو وہ کلاسیکل شعرا سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔

میر تقی میرؔ اپنے عہد کے نامور شاعر تھے اور موجودہ عہد میں بھی میر کا نام نہایت ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ میرؔ غزل کے میدان کے بے تاج بادشاہ تھے ان کی شاعری میں وہ درد اور اثر تھا کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ میر تقی میرؔ کے کلام سے متعلق ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

"میرؔ کی غزل نے انسانی تجربے کو ارتکازی صورت دی ہے اور اس میں ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی آواز بھی مجسم ہو گئی ہے۔"(۱)

میر تقی میر کا شعر ہے:

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا(۲)

ناصر کاظمی کا شعر ملاحظہ ہو:

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا (۳)

ناصر کاظمی نے اپنے شعر میں دل دھڑکنے کا سبب بتا دیا اب سمیع اللہ قریشی کا شعر ملاحظہ فرمائیں جو میر تقی میرؔ اور ناصر کاظمی کے رنگ و انداز میں ہے:

دل جب خاص ادا سے دھڑکے
کچھ تو اس کا بھی سبب ہوتا ہے (۴)

درج بالا اشعار میں مضمون یکساں ہے مگر طرز ادا میں فرق ہے تینوں شاعروں کی انفرادیت ظاہر ہے۔

سمیع اللہ قریشی کبھی کبھار تضمین بھی کرتے ہیں اور حسبِ ضرورت اس میں تحریف بھی کر لیتے ہیں جیسے سمیع اللہ قریشی کا یہ شعر:

بہت دونوں سے تیری یاد بھی نہیں آئی
اب اپنا دل بھی مجھے بے وفا سا لگتا ہے (۵)

اب ناصر کاظمی کا وہ مصرع دیکھیں جس میں انہوں نے تضمین میں تحریف کی ہے:

ع ایک مدت سے تیری یاد بھی نہ آئی ہمیں (۶)

اسی طرح یہ شعر ملاحظہ فرمائیں جو حسرت موہانی کے رنگ شعر میں ہے:

ہے حسن جہاں تاب کی حرمت کا تقاضا
دیکھو تو کبھی آنکھ میں بھر کر بھی نہ دیکھو (۷)

حسرت کا شعر:

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا (۸)

اسی طرح سمیع اللہ قریشی کی غزل ملاحظہ فرمائیں جو مجید امجد کی غزل کی زمین میں کہی گئی ہے:

بس اِک عشق آبلہ پا ہے اور میں ہوں
وہی پُرانی راہ وفا ہے اور میں ہوں
اس کو جاتے دیکھ رہا ہوں اور چپ ہوں
سینے میں اک حشر برپا ہے اور میں ہوں
تم نے دیکھا تم سے میں کب دور ہوا
تم نے میرا نام لیا اور میں ہوں
اپنا رشتہ اِن سے آج بھی قائم ہے
تنہائی ہے سناٹا ہے اور میں ہوں (۹)

استفہامیہ انداز میں شعر کہنا بذاتِ خود حسن و خوبی کی پیدائش کا موجب ہے۔ استفہامیہ یا سوالیہ انداز میں شعر یا مصرع کہنا بھی اُردو شاعری کی ایک قدیم روایت ہے۔ اس روایت میں غالبؔ کا نام کافی شہرت کا حامل ہے۔ غالبؔ نے استفہام کے استعمال سے جیسا فائدہ اُٹھایا ہے کسی دوسرے شاعر نے نہیں اُٹھایا۔ غالبؔ کے کلام میں کیا؟ کیوں؟ کیونکر؟ کب؟ کب تلک؟ کدھر؟ کس؟ وغیرہ کے الفاظ اُن کے لہجے میں ایک خاص انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔

سمیع اللہ قریشی کے ہاں بھی ہمیں استفہامیہ انداز کے بے شمار اشعار ملتے ہیں جو نا صرف کلام میں فصاحت و بلاغت اور معنویت پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں بلکہ زندگی اور زندگی سے متعلقہ مسائل کی نشاندہی بھی کرتے

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

ہیں:

وہ کون تھا کہ جو بے ساختہ ملا ہم سے
کہ ایسا کوئی ہمیں بے سبب کہیں نہ ملا (۱۰)
نہ اب وہ رنگ نہ خوشبو نہ تازگی نہ مہک
میں عارضوں کے شگفتہ گلاب کس سے لوں (۱۱)
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کچھ تو ہو پر کیسے ہو؟
عمر تو عمر ہے بھائی وہ تو فعلیت سے طے ہوتی ہے (۱۲)

مندرجہ بالا اشعار سمیع اللہ قریشی کے استفہامیہ اندازِ بیان کی شاندار مثال ہیں۔ ان الفاظ کا مناسب استعمال اور سادگی سے جو مٹھاس اور شیرینی پیدا ہوئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یقیناً اِن سے باتوں کو پُر زور بنانے میں بھی خاصی مدد لی گئی ہے اور قاری کو سوچ اور فکر کی طرف بھی اُبھارا گیا ہے۔

مزید ایک شعر دیکھیے جس میں استفہامیہ اندازِ بیان سے کیا خوب صورتی اور سلاست پیدا کی گئی ہے:

کوئی عشاق کی کمی ہے؟ مگر
کب کہیں جاں نثار ملتا ہے (۱۳)

سمیع اللہ قریشی اپنے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ہندی الفاظ کا استعمال بھی کلاسیکی شعرا کے ہاں رہا ہے جس کی وجہ شاید پاک و ہند کے باشندوں کا اکٹھے رہنا اور باہمی میل ملاپ تھا لیکن اس کے بعد ہندی الفاظ اردو شاعری تک مکمل طور پر نہ سہی بہت حد تک کم ضرور ہو گئے تھے لیکن طرزِ جدید اور نئی فکر کے حامل شعرا کے ہاں اِن کا استعمال ایک خاص طرح سے دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔ سمیع اللہ قریشی نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ کی بھرمار نہیں کی لیکن جہاں بھی ہندی الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے وہاں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

سمیع اللہ قریشی کی شاعری سے چند مثالیں:

نہ چھت ہے، نہ چھاؤں ہے، نہ چھایا ہے
سارے پڑاؤ، ٹھور، ٹھکانے ختم ہوئے (۱۴)
اپنا جینا، جاگنا، رہنا، بسا اس کے دم سے ہے
جس کے پیراہن کا ہر ہر جھونکا دستِ صبا ٹھہرا (۱۵)

دھیرے دھیرے یہ شیوہ بھی ہم نے سیکھ لیا
اپنی جان پہ ہر دکھ سہنا لیکن چپ رہنا(۱۶)

ان اشعار میں چھت، چھاؤں، چھایا، ٹھور، ٹھکانے، پڑاؤ، جینا، جاگنا، رہنا، بسنا، جھونکا، دھیر دھیرے، ہندی الفاظ ہیں۔

محاورے کے لغوی معنی گفتگو اور بات چیت کے ہیں۔ چاہے وہ گفتگو اہلِ زبان کے اُسلوبِ بیان کے مطابق ہو یا نہ ہو لیکن اصطلاحِ علمِ بیان میں اس کلمے یا کلام کو محاورہ کہتے ہیں جو اہلِ زبان کے اُسلوبِ بیان کے مطابق ہو اور اپنے حقیقی معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں مستعمل ہو۔

اُردو شاعری کے جہاں بے شمار رنگ ہیں وہاں ایک رنگ اشعار میں محاورہ بندی کا استعمال بھی ہے۔ محاورے کی زبان سے نا صرف شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے بلکہ بات کو موثر اور دل فریب پیرائے میں قاری تک پہنچانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ اُردو کے کلاسیکی شعرا کے ہاں بھی محاوروں کا خوب صورت استعمال دیکھنے میں ملتا ہے، اور یہ روایت چراغ سے چراغ جلنے کی مانند آج تک چلی آ رہی ہے۔ سمیع اللہ قریشی کی غزل میں محاوروں کا استعمال بڑی خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ وہ محاورہ کی زبان سے اپنا مدعا بیان کرنے کی بھی مہارت رکھتے ہیں انہوں نے جو محاورات اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں۔ اُن میں ایک عام خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت عام فہم اور عام استعمال کے محاورے ہیں:

تو کبھی دیکھے آنکھ بھر کے ہمیں
ہم کبھی ایسے محترم نہ ہوئے(۱۷)

اس شعر میں ''آنکھ بھر کے دیکھنا'' محاورہ ہے۔

گھر ایک اپنا بھی، اپنا بھی ایک آنگن ہو
اس ایک خواب کو تُو نے بھی تو بُنا ہو گا(۱۸)

اس شعر میں ''خواب بُننا'' محاورہ ہے۔

بڑے خلوص سے ہم ہار دیں گے جاں اپنی
مگر جو دل سے دکھائے ہمیں ادا کوئی(۱۹)

اس شعر میں ''جاں ہارنا'' محاورہ ہے۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

ساری عمر تو اُس نے ہم سے ہاتھ کیا
کیوں نہ اب ہم بھی کچھ اس سے ہاتھ کریں (۲۰)

اس شعر میں "ہاتھ کرنا" محاورہ ہے۔

لوگ ساحل پہ کھڑے راہ تکے جاتے ہیں
اور سفینہ کہ ابھی بیچ بھنور ہو جیسے (۲۱)

اس شعر میں "راہ تکنا" محاورہ ہے۔

بحر سے مراد کسی بھی شعری تخلیق کا عروضی پیمانہ ہے انگریزی زبان میں اس کے لیے "Prosody" اور ہندی زبان میں بحر کے لیے "پنگل" کا لفظ مستعمل ہے۔ اُردو زبان میں بحر کے لیے "عروض" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں مروجہ عروضی نظام فارسی کے توسط سے آیا ہے۔ فارسی شعرا شعر کہنے کے لیے بحروں کا استعمال کرتے تھے۔

فارسی اثرات کے تحت اردو میں بھی وہی بحریں استعمال ہونے لگیں۔ اردو شاعری میں مروجہ بحریں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ رواں بحریں بھی ہیں اور ایسی بحروں کے استعمال کی مثالیں بھی عام ملتی ہیں۔ جن کی روانی اوبڑ کھابڑ رستوں کا شکار ہوتی ہے۔

طویل بحروں میں شعر کہنے کے لیے چوں کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کی گنجائش ہوتی ہے۔ لہٰذا بیانِ معانی کے لیے بہت سی سہولیتں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ایک شاعر جب کسی مختصر بحر میں شعر کہتا ہے تو پیمانہ تنگ ہونے کی وجہ سے شاعر کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ طویل بحر میں شعر کہنا دریا کی روانی کے مترادف ہے جب کہ چھوٹی بحر میں شعر کہنا تنگ ندی میں تیز بہاؤ کی کوشش کا نام ہے لیکن بحر اور عروض کی پابندی نا صرف شعر میں حسن پیدا کرتی ہے بلکہ اس سے شعر کے اوزان بھی پورے رہتے ہیں موجودہ دور میں بحر اور بحر کے استعمال کو پُرانی روایت جان کر زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی لیکن اس کی اہمیت بہر حال مسلّم ہے۔ بحر کیا ہے؟ اس کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"علمانے وزن کی صحت اور سقم کو جاننے کے لیے چند قاعدے وضع کیے ہیں جن کے مجموعے کو عروض کہا جاتا ہے۔ علمِ عروض کا موجد "خلیل ابنِ احمد بصری" ہے، ہندی عروض کو پنگل کہا جاتا ہے۔ عروضیوں نے جو موشگافیاں روا رکھی ہیں اور عروضی اصطلاحات کا جو انبار لگا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN (Online): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

ہے۔ اُس کا مذاق اُڑانا ایک فیشن بن چکا ہے اور جدید تنقید میں عروض کو کوئی باوقار بھی حاصل نہیں رہا لیکن شاعر اور نقاد عروض سے آزاد اور بے نیاز ہر گز نہیں ہو سکتے۔"(۲۲)

اردو شاعری میں طویل اور مختصر بحریں بہت عام ملتی ہیں۔ مختصر بحریں کم و بیش ہر شاعر کے ہاں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں کلاسیکی شعرا میں میرؔ اور جدید شاعروں میں باقی صدیقی اور ناصر کاظمی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

سمیع اللہ قریشی بھی اُن شعرا میں سے ہیں۔ جنہوں نے مختصر بحروں میں بھی بڑی مہارت اور خوب صورتی سے غزلیں کہی ہیں۔ انہوں نے طویل بحروں کو بھی بطریق احسن برتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار:

کس کس رنگ پہ اور خوشبو پہ ہار گئے ہم کیا کیا کچھ
راہوں میں تو کیا کیا کچھ تھا، آخر میں تو کھائی تھی
جھرنا تھا جو صبح سویرے پتھر چیر کے پھوٹا تھا
سوچ رہے ہیں یہ تیری آواز تھی یا شہنائی تھی
تیرا نام آیا تو ساتھ ہمارا نام لیا سب نے
یہ سوائی تھی تو ہائے یہ بھی کیا رسوائی تھی(۲۳)

طویل بحروں کے ساتھ ساتھ مختصر بحروں میں بھی ان کی شعری مہارت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں اِن کے کلام سے مختصر بحر میں لکھی گئی غزل کے چند اشعار:

جب دلِ بے قرار ملتا ہے
یہ مجھے زار زار ملتا ہے
عمر بھر عشق کے نتیجے میں
ایک بس انتظار ملتا ہے
جانے والے تو پھر کبھی نہ ملے
راستوں کا غبار ملتا ہے
اب کہاں ہے بہار گلشن میں
اب تو عکسِ بہار ملتا ہے(۲۴)

طویل بحر کی نسبت مختصر بحر میں شعر کہتے ہوئے شاعر کے پاس الفاظ کی کمی ہوتی ہے۔ ایک مختصر حد میں

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

رہتے ہوئے اس کو اپنا مطمع نظر کچھ اِس طرح بیان کرنا پڑتا ہے کہ اُس میں حُسن و دلکشی کا عنصر بھی بہر طور موجود رہے، اوپر درج کی گئی غزل کے اشعار کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سمیع اللہ قریشی نے بحر کی پابندی کو بطریقِ احسن نبھایا ہے۔ انہوں نے مختصر بحر کو اس طرح اپنے شعروں میں برتا ہے کہ عروضی پیمانے ذرا بھی متاثر ہونے نہیں پائے۔ اسی سلسلے میں سمیع اللہ قریشی کی غزل کے چند اور اشعار دیکھیے:

دوستی کے جواب میں ملیے
بن کے خوشبو گلاب میں ملیے
آپ نے مجھ کو اپنا کب جانا
آپ کیوں مجھ کو خواب میں ملیے
آپ جانیں نہ آپ پہچانیں
آپ سے کس حساب میں ملیے
دل میں آجایئے کرن کی طرح
کچھ اسی آب و تاب میں ملیے (۲۵)

ڈاکٹر آصف رازؔ، سمیع اللہ قریشی کی غزل کی بحر کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''سمیع اللہ کو چھوٹی بحر میں بھی غزل لکھنے کا فن آتا ہے یہ چھوٹی بحر میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو معنویت کے اعتبار سے اپنے اندر وسیع اور گہرے ہوتے ہیں۔'' (۲۶)

ترنم اور موسیقیت شاعری میں ایک خاص طرح کا ترفّع پیدا کر دیتے ہیں۔ گائی جانے والی غزلیں مدتوں سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ یوں بھی موسیقی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو تاثر شاعری محاکات کے ذریعے ابھارتی ہے وہی تاثر موسیقی سر گم کے زیر و بم سے پیدا کرتی ہے۔ سمیع اللہ قریشی کے کلام میں بے شمار غزلیات ایسی ہیں جن میں ترنم اور موسیقیت موجود ہے:

کوئی شام تھی، کسی گلی میں اِک چُنری لہرائی تھی
اس کی اوٹ میں کیسا چاند تھا جس نے چھب دکھلائی تھی
خواب ہوئے وہ نقش وہ خد و خال وہ لہراتے پیکر
دل کے آئینے میں ہم نے اِک تصویر بنائی تھی

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

عمریں گزریں، جُگ بیتے، پر ہم نہ اس کو بھول سکے
جس کی خاموشی میں ایک قیامت کی گویائی تھی (۲۷)

اب مختصر بحر کے چند اشعار جن میں غنائیت و موسیقیت موجود ہے

اب یہ نیت تو دھارنی ہو گی
چادرِ شب اتارنی ہو گی
دوستوں سے بھی دوستی نہ ملے
یہ اذیت سہارنی ہو گی (۲۸)

''علمِ بیان اُن قاعدوں اور ضابطوں کا نام ہے جن کے ذریعے ایک بات کو معنی کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے ادا کیا جا سکے اور اس سے بیان موثر اور دلنشین ہو اور اُسلوب میں ندرت پیدا ہو۔''(۲۹)

بیان کے معنی ہیں وہ شستہ اور فصیح تقریر یا تحریر جس کے ذریعے انسان اپنے دل کی بات ظاہر کرے۔ تقریر اور تحریر کی خوبیوں کے ذکر اور ان کی بحث کو بھی ''علمِ بیان'' کہا جاتا ہے۔

کلاسیکی شعرا کے ہاں بھی اس کی مثالیں بہت عام ہیں اور جدید دور کے شعرا میں بھی یہ رجحان خاصا صحت مند ہے۔ مجید امجد نے استعاروں اور علامتوں کا بڑا خوب صورت استعمال اپنے کلام میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ن۔م راشد اور دیگر کئی شعرا نے اپنے کلام میں علمِ بیان کے کئی نادر نمونے اور شاہکار چھوڑے ہیں۔ سمیع اللہ قریشی بھی ایسے شاعر ہیں جو اُردو گرامر اور دیگر قواعد اُردو کے پوری طرح معترف ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام، خصوصاً غزل میں علمِ بیان و بدیع کے کئی نادر نمونے پیش کیے ہیں۔ ذیل میں اُن کے کلام میں علمِ بیان کی استعمال شدہ اصطلاحات کی چند مثالیں درج کی جا رہی ہیں۔

''تشبیہ کے معنی ہیں یہ جتانا کہ ایک چیز ایک معنی میں بلا تجرید و بلا استعارہ دوسری چیز کی شریک ہے مثلاً اس کا قد سرو جیسا ہے یعنی راستی ہیں دونوں مساوی ہیں۔''(۳۰)

علمِ بیان کی رو سے جب ایک چیز کو مشترکہ خصوصیات کی بنا پر دوسری چیز کی مانند قرار دیا جائے وہ خصوصیات دوسری چیز میں زیادہ پائی جاتی ہو تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ اُردو شاعری میں تشبیہات کے استعمال کا رجحان خاصا عام ہے۔ کلاسیکی شعرا نے بھی تشبیہ کو بطورِ خاص استعمال کیا ہے۔ کہیں میر تقی میر محبوب کے ہونٹوں کو

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber 2021)

گلاب کے پھول سے تشبیہ دیتے نظر آتے ہیں تو کہیں میر دردؔ زندگی کو طوفان سے تعبیر کر کے تشبیہ کے استعمال کی روایت جوڑتے ہیں۔ بعض تشبیہات پُرانی شاعری سے لے کر اب تک برتی جارہی ہیں جن میں آنسوؤں کی روانی کو ابر کے برسنے سے اور زندگی کی مشکلات کو سمندروں اور دریاؤں کے کٹھن سفر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ سمیع اللہ قریشی کی غزل میں تشبیہات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں بعض تشبیہات ایسی ہیں۔ جو کلاسیکی عہد سے چلی آرہی ہیں لیکن اُنہیں موضوع اور مضمون بدل کر اس خوب صورتی سے برتا گیا ہے کہ اُن کا حُسن پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے اور ایک عجب تازگی اور فرحت کا احساس بھی ہوتا ہے۔

سمیع اللہ کی غزل سے تشبیہ کی چند مثالیں:

رقص، آواز، مہک، سبزہ و گُل، تصویریں
آسمانوں سے اترتے ہیں ستارے کیا کیا(۳۱)

وجود اس کا ہے اِک ریشمی اُجالا سا
کلام نرم بھی ہے، خواب ناک بھی ہے بہت(۳۲)

حریم دل وہ صدف ہے تم اس کے موتی ہو
جو ہو سکو کبھی مانوس اس مکان سے تم(۳۳)

چاند سے چہرے پر معصوم حیا کی بدلی ہو
زلفوں کو مکھڑے سے ہٹانا لیکن چپ رہنا(۳۴)

اِن اشعار میں ستارے، ریشمی اُجالا، صدف، چاند، خوب صورت تشبیہات ہیں۔

فنی اعتبار سے سمیع اللہ قریشی کی غزل روایت کی پاسداری سے مزین ہے۔ الفاظ کے در وبست، تراکیب و مرکبات، صنائع بدائع، فصاحت و بلاغت، قافیہ و ردیف، مصرعوں کی بناوٹ، تلمیح و استعارات، علامات و تلازمات کے معاملے میں اختیاط سے کام لیتے ہیں۔ دی گئی وضع کے مطابق استعمال میں لاتے ہیں۔ موصوف فراقؔ، فیضؔ، ناصرؔ وعدمؔ وغیرہ کے طرز کو مروج کرنے والوں میں سے ہیں فنی آہنگ وسلیقہ ہم عصر شعرا سے ہم آہنگ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۳

۲۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص ۳۱

۳۔ ناصر کاظمی، کلیات ناصر، لاہور، ناصر کاظمی بک سوسائٹی، جنوری ۲۰۰۳ء، ص ۴۷

۴۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص ۵۱

۵۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص ۷۷

۶۔ کلیاتِ ناصر، ص ۷۸

۷۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص ۷۵

۸۔ حسرت موہانی، کلیاتِ حسرت، لاہور، خزینہ علم و ادب، نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۹

۹۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص ۲۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۱۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص ۳۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۳۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جہاں، ص ۵۶

۱۴۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص ۵۷

۱۵۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص ۱۴۳

۱۶۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص ۲۱

۱۷۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص ۷۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۹۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص ۸۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۵

۲۲۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جولائی ۱۹۸۵ء،

ص۱۲۲
۲۳۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص۵۹
۲۴۔ ایضاً، ص۵۶
۲۵۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص۴۱
۶۲۔ آصف زار، ڈاکٹر، سمیع اللہ قریشی کی شاعری۔۔۔، مشمولہ: رقصِ بسمل، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۷، اپریل تا
جون، ۲۰۲۱ء، ص۱۸
۲۷۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص۵۹
۲۸۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص۱۱۷
۲۹۔ منصب علی سحاب، نگارستان، لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۰ء، ص۱۴۳
۳۰۔ عابد علی عابد، سید، البیان، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص۹۰
۳۱۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص۸۴
۳۲۔ ایضاً، ص۳۵
۳۳۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، سرِ مسافتِ جاں، ص۷۷
۳۴۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، پرتو نقشِ خیال، ص۲۱